نوآباد کار سے مزاحمت: راشد کی نظم کے تناظر میں

Resistance from colonialist: In the context of Rashid's poem

[1] ڈاکٹر محمد عمران ازفر

Abstract:

Modern Urdu poem is different progressive and anti-colonial text, British Raj disturb the ethical social political and cultural values of Indo Pakistani society of their era. Modern poet N M Rashid represented the exploitation of human in his society with various angles. He has depicted the contemporary situation in his poetry. His first three books are real picture of his thought process about colonial and his tactics to expand Colonialism. Guman Ka mumkin, the last book of Rashid was full of philosophy and deep human resources about physical and metaphysical world. This article shows ethical, socio, political and human approach in colonial period from Rashid's poetic text.

Keywords: Resistance, Colonialism, Anti-colonial thought, urdu poem, Rashid

جدید اردو نظم مختلف ترقی پسند اور نوآبادیاتی مخالف متن ہے، برطانوی راج نے اس دور کے ہندوستانی پاکستانی معاشرے کی اخلاقی سماجی سیاسی اور ثقافتی اقدار کو متاثر کیا ہے۔ جدید شاعر این ایم راشد نے اپنے معاشرے میں انسانی استحصال کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کی صورت حال۔ ان کی پہلی تین کتابیں نوآبادیات کے بارے میں ان کے فکری عمل اور استعمار کو وسعت دینے کی حکمت عملی کی حقیقی تصویر ہیں ۔ رشید کی آخری کتاب، فلسفہ اور جسمانی اور مابعدالطبیعاتی دنیا کے بارے میں گہرے انسانی وسائل سے بھری ہوئی تھی۔ راشد کے شاعرانہ متن سے نوآبادیاتی دور میں اخلاق، سماجی، سیاسی اور انسانی نقطہ نظر کو ظاہر کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: مزاحمت، استعمار، استعمار مخالف فکر، اردو نظم، راشد

ذات کا کھوج، مایوسی، بے بسی، تنہائی کا کرب، انفرادیت کی جستجو، موت کا خوف، موجود پر عدم اعتماد، معنی کے دائرے میں سچائی کے امکان کی تلاش اور متوسط طبقے کی معاشرت سے جڑے لامحدود مسائل کی نشاندہی جدیدیت کے مرکزی موضوعات میں شامل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ جدیدیت اپنی فکری تنظیم میں کلاسیکیت کی اجتماعیت پرستی کے برعکس نئے زمانے کے فرد کی زندگی کو موضوع بناتی ہے۔ جدیدیت اور اس سے جڑے دیگر طبقہ فکر ہجوم میں کھوئے اکیلے شخص کے مسائل پر نگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے فروغ سے تیزی سے بڑھتی اوسط طبقے کی زندگی کے متفرق عوامل پر ڈسکورس قائم کرتی ہے۔ دانتے نے عوامی زبان کو شاعری کا مرکزی جوہر قرار دیا مگر شاعری اور ادب کی دیگر اصناف میں عوامی زندگی کے حقیقی رنگوں کو جدید

---

[1] لیکچرر (اردو)، سرگودھا یونی ورسٹی، سرگودھا

تحریکوں کے زیر اثر ہی درست نمائندگی ملی۔ مغربی سماج کے تناظر میں جدیدیت کا حقیقی آغاز نشاۃ الثانیہ کے زمانے سے ہوتا ہے۔ نشاۃ الثانیہ وہ تحریک ہے جس نے مغربی معاشرے کو مُلا، شہنشاہ اور تاجر کے چُنگل سے نجات دلا کر سچی آزادی کے تصور سے آشنا کیا جس کے نتیجے میں مغربی معاشرے میں ''انسان دوستی'' بطور مرکزی فکری رجحان کے طور پر راسخ ہونے لگی۔ انسان اور اس کی شناخت ہی جدیدیت اور اس سے جڑے تمام فکری مکاتیب کا بنیادی جوہر ہے۔ ''جدیدیت کی ساری لہریں اسی انسان پرستی کی فضاء سے گزرتی ہیں۔''[۱]

مغرب میں ادب، مصوری، آرٹ، فلسفہ، موسیقی سمیت تمام نمایاں تحریکیں اپنے جوہر میں انسان اور انسانی جذبے و احساس کے تصور پر استوار ہیں۔ گوپی چند نارنگ جدید فکری روایات کے حوالے سے شمس الرحمن فاروقی کی رائے کا حوالہ دیتے ہیں، کہ:

> ''ادبی اصول و نظریات کو میں ترقی پسندوں کی طرح مطلق اور آفاقی اور ہمہ وقتی نہیں سمجھتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادب کے بارے میں کئی طرح کے نظریات صحیح ثابت ہو سکیں گے۔ جدیدیت کوئی مذہب نہیں، کوئی الہامی فلسفہ نہیں، جس سے انحراف کفر ہو۔''[۲]

نشاۃ الثانیہ ہو، کلاسیکیت ہو، رومانی تحریک ہو بیسویں صدی اور دو عظیم جنگوں کے خمیر سے وقوع پذیر ہوتی جدت کی تحریکیں ہوں، ان کا اطلاق صحیح معنوں میں مغربی ادب پر کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب پر نگاہ کی جائے تو ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے نمایاں ناقد حالی نے مغرب کی برتری کو قبول کر لیا تھا۔ وہ انگریزی ادب اور انگریز شعرا کو اردو ادب اور اردو شعرا سے بہتر تسلیم کرتے تھے اور معاصر مصنفین سے متقاضی تھے کہ وہ مغربی ادب اور مصنفین سے کسب فیض کریں۔ سرسید، حالی، آزاد سمیت کتنے نمائندہ تخلیق کار ہیں جو انگریز اور انگریزی ثقافت کو خود سے اور اپنی ثقافتی اکائی سے برتر تسلیم کرتے ہیں۔ حالی شاعری کو اصلاحِ معاشرہ اور سماجی مقاصد کے لیے استعمال میں لانا چاہتے ہیں مگر اس عمل میں وہ انگریز سامراج کی برتری کو تسلیم کر کے آگے بڑھنے کے قائل ہیں اور اسی نوعیت کی فکری تنظیم کا تقاضا شعرا سے بھی کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ حالی کا اپنا

تصور ملک و ملت انگریز فکر اور برتری سے مغلوب ہے اور نہ ہی وہ شعری متن میں کوئی ایسی ترتیب چاہتے ہیں جو نوآبادکار کے حقیقی کردار کو سامنے لانے، مقامی افراد کو درپیش مسائل، انسانی زندگی میں پائی جانے والی افراتفری کا کوئی تذکرہ کرے، تاوقتیکہ کہ اقبال، راشد، تصدق حسین خالد، میراجی، مجید امجد، فیض کی نظم کا باطن اس صورت سے برعکس ہو کر سامنے آیا اور انہوں نے اپنے شعری متون کے توسط سے ہندوستانی معاشرے میں موجود انسان کی زندگی کو تخلیقی پیرائے میں بیان کیا، یہ شعری متون اس شاعری سے مختلف ہیں، جس کا تقاضا حالی اور ان کے ہمنوا اردو تخلیق کار سے کرتے آئے ہیں۔ اس ذیل میں مولانا حالی اعلیٰ شاعری کے اجزا بارے مغربی شاعر ملٹن کو مقامی روایت پر فوقیت دیتے ہوئے ان کے الفاظ میں اردو کے شعرا کو سمجھاتے ہیں کہ شعر کی خوبیاں کیا ہونا چاہیں:

> ''ملٹن نے ان کو چند مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔''[۳]

مولانا حالی یہ الفاظ لکھتے ہوئے اردو ادب میں مثنوی نگاری کی پوری روایت کو رد کرتے ہیں، جو سماجی تفاعل میں فرد اور اس کی کارکردگی، کارِ حکومت اور عوام، دین اور اس کے عمومی زندگی پر اثرات ایسے موضوعات سے بھری ہوئی ہے، مولانا حالی اس فکر کے زیر اثر نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، کون سا ایسا ناقد ہے جو نظیر کی شاعری کو سادہ، پرجوش اور اصلیت سے عاری قرار دے سکتا ہے؟ مگر نوآبادیات کی بنیادی شرائط میں اولین نوآبادکار کو نوآبادی سے برتر، اعلیٰ، مہذب اور فاتح دکھانا ہوتا ہے۔ استعماریت کا عمل محض معاشی نظام پر اجارہ قائم کرنا نہیں بلکہ استعمار اپنی نوآبادیوں کی زبان، ادب، تمدن، ثقافتی تنظیم کے بارے مستحکم تصورات کو منقلب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور اس نئی تقلیب میں مقامی کو کم تر اور بدیسی کو برتر دکھایا جاتا ہے۔ استعماری طاقت، جس نے ہندوستان میں نوآبادیاتی منظرنامے تشکیل دئے اپنی اساس میں اس تعریف پر جانچی جاسکتی ہے:

> ''Colonialism کو کسی محکوم قوم یا رقبے پر اقتدار قرار دیا گیا ہے۔ تعریف کا دوسرا حصہ

> محکوم پر استبدادی حکمرانی کی حکمت عملی کی طرفداری کو استعماریت میں شامل کرتا ہے۔۔۔ استعمار کاری کا عمل محکوم قوموں کے وسائل پر قبضہ تو تھا ہی اس کے علاوہ ان قوموں پر اس نے بڑے ہمہ گیر اثرات ڈالے ہیں۔ زبان، ادب، ثقافت، علم و حکمت وغیرہ زندگی کا کوئی شعبہ شاید ہی ایسا ہو جو استعماریت کے اثرات سے بچ پایا ہو۔''[۴]

جدیدیت کو اگر تیسری دنیا کے ممالک میں دیکھا جائے، جن کے زیادہ تر حصے اس وقت برطانوی استعمار کے زیر انتظام تھے، اپنی فکری، ثقافتی، سیاسی، ادبی حیثیت میں نوآبادیاتی اثرات میں پنپنے پر مجبور تھے اور شاید اسی سبب سے سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی اپنی سرزمین کے نابغہ ءروزگار تخلیق کار پر توجہ دینے کی بجائے استعمار کی حیثیت، ان کے طریقہ ءحکومت سمیت ہر حکمت عملی سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر یہ حقیقت اپنی پوری منہ زوری کے ساتھ عیاں ہے کہ ہندوستانی تخلیق کار نے ہر عہد میں استعمار کے مختلف چہروں کے خلاف خوب جم کر لکھا ہے۔ اس ذیل میں عثمان غنی کی رائے دیکھیں:

> ''میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد ہیں جن کی شاعری میں سوزِ وطن سوزِ گلستاں و چمن کے استعارے اور لبادے میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس دور کی غزلوں میں ظالموں اور غارت گروں کو گل چیں اور صیاد کا نام دے کر بیان کیا جاتا تھا۔''[۵]

محولہ بالا شعرا کا زمانہ حیات اٹھارویں صدی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان بیرونی مداخلت کے زخم روز روز کھاتا ہے اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ گھاؤ مزید گہرے اور تکلیف دہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کا وہ عہد تھا جب مغلیہ سلطنت کے زوال کا نقارہ بج چکا تھا۔ بیرونی طاقتیں اور اندرونی سازشی مغلیہ سلطنت کو ختم کر دینے کی منصوبہ بندی میں مصروف عمل تھے۔ ابدالی ہو یا مرہٹہ، سکھ ہوں یا جاٹ اور گوجر سب دہلی کو تباہ و برباد کرنے پر تلے تھے۔ یہ میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، میر درد کا زمانہ ہے جب ابدالی نے دہلی کو خوب لوٹا، یہاں کے باشندوں کی خوب خوں ریزی کی، ان کے گھر بار تباہ و برباد کیے اور مال و اسباب لوٹ کر، حُسن کے خزانوں سے کھیل کر، مقامی دانش کو اذیت کے زخم دے کر واپسی اختیار کی۔ ایک طرف انگریز کا زور دوسری جانب روہیلوں کی منصوبہ بندی اور جاٹوں کی ہنگامہ خیزی، سب کی نگاہ دہلی کے تخت پر مرکوز تھی۔

اسی لیے میر کے کلام میں یاس و مایوسی اور قنوطیت دیکھنے کو مل جاتی ہے, زندگی اور خوشی سے دوری میر کی آنکھوں میں پھرے ان نقشوں کے سبب سے ہے جو ان کے سامنے برپا ہوئے مگر ان شعرا کے ہاں نو آبادت اور استعمار کے تصورات، اس خطے کے لوگوں کی سادہ لوحی اور جدید علوم سے عدم واقفیت کی بنا پر دکھائی نہیں دیتے۔

انگریز راج کے بعد اردو تنقید نے مغرب پرستی کی راہ اختیار کی، مقدمہ شعر و شاعری کا خاص کردار اردو تنقید کو قدیم ادبی روایت، فارسی، ہندی، سنسکرت کے اصولی اور قواعدی نکات سے الگ کر کے مغرب کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی، جس میں حالی کامیاب رہے۔ مغربی جدیدیت معاشرتی سطح پر نئے خدو خال واضح کرنے کا عمل ہے۔ یہ نئی شیرازہ بندی روائتی حصار کی جزوی شکست، روح کی مرکزی توڑ پھوڑ کو بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔اس تحریک میں تہذیب، ثقافت، مذہب اور روحانیت کے سوال بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔[۶]

بیسویں صدی کو ہندوستانی سماج کے تناظر میں استعماریت زدہ قرار دیا جائے یا برطانوی نو آبادی کے طور پر دیکھا جائے، دونوں صورتوں میں نظم وہ صنف ہے جس نے سب سے پہلے اور پوری شدت کے ساتھ مقامی ثقافت اور اجتماعی شعور کی بازیافت کا مقدمہ لڑا۔ یہ نظم دیسی ثقافت کو کم تر تسلیم کرنے اور برطانوی راج کو برتر ماننے کو قطعاً تیار نہیں ہے۔ تصدق حسین خالد کی نظمیں ملاحظہ کریں یا مجید امجد، میراجی، ضیا جالندھری، اختر حسین جعفری کے نظمیہ متون میں برتے گئے تشبیہاتی، استعاراتی اور علامتی نظام کو جانچا جائے، ان میں اپنی زمین سے انسیت، مقامی باشندوں کے ساتھ وابستگی اور استعمار کے حوالے سے ایک خاص طرح کی خفت کا احساس ملتا ہے۔ یہ شعرا اپنی زمین پر غیر کے تسلط کو ماننے سے انکاری ہیں۔ان کا طرز اکبر الہ آبادی کا سا طنزیہ اور کاٹ دار نہیں، نہ ہی یہ شعرا مقامی لوگوں کی تکذیب سے لطف کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی ذات پر طنز کر کے اپنی کمزوری پر نوحہ خوانی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ تصدق حسین خالد "شیر دل خاں" ایسی نظموں کے توسل سے نو آبادکار کی آگ میں جھونکے گئے ہندوستانی کی جان کو لگے آزار کو شعری زبان میں بیان کرتے ہیں۔ان کی نظم پورے تخلیقی بہاؤ کے ساتھ نوجوان شیر دل خاں کی زندگی کے شب و روز کے تمثال

بناتی ہے جو اپنی منگیتر سے ہزاروں میل دوری پر بندوق تانے، اپنی چھاتی میں پیوست ہونے والی گولی سے بے خبر، اپنی زمین اور اپنے رشتوں کے لیے تڑپ رہا ہے مگر وہ ایک نوآبادی کا باشندہ ہے جس پر حاکم نوآبادکار اپنے حصے کی جنگ اپنے غلاموں پر مسلط کرتے ہیں۔ الطاف حسین حالی کے نزدیک شاید یہ برتر انگریز کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنے کا ایک عملی اظہار ہو، ممکن ہے سر سید احمد خان اس عمل کو انگریز کی تمدنی برتری اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیش قدمی جبکہ ہندوستان کے باشندوں کی علم سے دوری کا نتیجہ قرار دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید شعرا نے نوآبادی اور نوآبادکار کے فرق کو کمال خوبی سے تمیز میں لانے کی دلیل فراہم کی ہے جس کی بنیاد میں انسان پرستی کا وہی جذبہ کارفرما ہے جس پر جدید مغربی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

راشد کی نظم نوآبادیاتی عہد کا وہ استعارہ ہے جس کی مدد سے ہندوستانی معاشرے میں سسکتے انسانوں کے حقیقی تمثال جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ماہرین راشد کی نظم کو اسلوب کی سطح پر اجنبیت اور ادق پن سے لبریز کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایسی نظمیں ہیں جن کو قاری نہیں ملتا، گو جزوی طور پر یہ بات درست ہے کہ راشد کی زبان دانتے کے مطابق عام بول چال کی زبان نہیں ہے، اس کے نظمیہ موضوعات ایذرا پاؤنڈ کی صلاح کے برعکس متوسط طبقے کی دانش سے ہم آہنگ نہیں ہیں، اس کی نظم کا اسلوب سادہ اور عامیانہ سطح کا نہیں ہے، لیکن یہ نظم اپنے جمالیاتی احساس اور موضوعاتی پہناوے میں معاصر انسان کو درپیش پیچیدہ اور گنجلک مسائل کا حقیقی شاعرانہ بیان ہے۔ یہ اس شاعر کی زبان ہے جس اپنی پوری توجہ اپنے پیغام کے اظہار پر مرکوز رکھی ہوئی ہے۔ اپنی اس مقصدی ذمہ داری کے باعث یہ نظمیں حسیات کی منہ زوری سے کسی سطح پر محروم رہتی ہیں۔ راشد کے شعری سفر کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''راشد کے پہلے دو مجموعوں کا کردار یہ تھا کہ ان کی نظمیں ایک نفسیاتی، جذباتی اور سیاسی رد عمل کا اظہار تھیں، بعد کی نظموں میں جو ان کے آخری دو مجموعوں میں شامل ہوئیں انسان، انسانیت، آزادی اور حریت جیسے تصورات ابھرتے ہیں۔ ان سب شعری مجموعوں میں وہ شعریت سے زیادہ فکر و افکار کی اشاعت میں زیادہ مصروف تھے۔ شاید تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہونے کے باعث وہ اس نوعیت کی شاعری تخلیق کرنے کے لیے مجبور

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شعوری سطح پر ہر ممکن طریقے سے انہوں نے اپنی شاعری کو زیبائش سے دور رکھا۔''[۷]

راشد کی نظم میں زیبائش و آرائش نہ ہونے کا سبب وہی فکر ہے، جو غلام ذہن کے اظہار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ہندوستان پر پنجے گاڑے استعمار کے گھناؤنے منصوبوں کا تخلیقی اظہار، معاشرے میں موجود فکری گھٹن کے اثرات اور پیچیدہ نفسیاتی عوامل راشد ابتدائی نظموں کے نمایاں موضوعات ہیں۔ راشد کی ابتدائی دو کتابیں ''ماوراء'' اور ''ایران میں اجنبی'' اپنے سیاسی، نفسیاتی اور جذباتی وابستگی کے عمل میں استعمار سے نبرد آزما ہیں۔ راشد کی نظم نہ صرف اچھے شعری تجربے سے مملو ہوتی ہے بلکہ یہ ہمارے شعور کی توسیع بھی کرتی ہے۔ یہ ہمارے ادراک اور احساس کو متاثر کرتے ہوئے مسرت بہم پہنچاتی ہے اور ہمارے سماجی، سیاسی، معاشرتی شعور میں وسعت اور فراوانی کا سبب بھی بنتی ہے اور یہی نوآبادیاتی زمین پر بستے شاعر کا رویہ اور تخلیقی وظیفہ ہونا چاہیے جس کے تحت وہ اپنی قوم کی سچی نمائندگی کا حق ادا کرے۔

غلامی اور استعماریت کے عہد میں راشد کے استعارے انقلابی اور ہمت افزاء ہیں۔ ان میں حوصلہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے جو اپنے قاری کے جذبات کو متحرک کرنے اور اسے اپنی شناخت کے لیے متحرک ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ راشد کے پہلے مجموعہ کلام ماوراء میں شائع ہونے والی نظم "سپاہی" میں قوم کی حالت دیکھیں جس پر راشد اپنی فکر کا اظہار کر رہے ہیں:

تُو مرے ساتھ کہاں تک جائے گی
موت کا لمحہ مایوس نہیں
قوم ابھی نیند میں ہے!
مصلحِ قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے۔[سپاہی، ماورا، ۷۷]

شاعری کے نظمیہ متون اپنے عہد کے زندہ مسائل کا تخلیقی بیانیہ ہیں جن میں شاعر بطور فرد اپنے

کردار کو بیان کر رہا ہے۔ ماوراء کی یہ نظم راشد کی ۱۹۴۲ء سے پہلے کی نظموں میں سے ایک ہے۔ اس عہد کی شاعری کا مطالعہ قاری کو آگاہ کرتا ہے کہ راشد وہ آواز ہے جو سر سید اور حالی کے نظریہ ضرورت کے تابع نہیں۔ اس کے ہاں قومیت کا تصور جداگانہ اور حقیقی ہے جس کی وجہ سے اس کی نظم کی تشکیل میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی موضوعات کی بڑی اہمیت ہے۔ جن میں استعمار اور نو آبادیات کے باہمی روابط کو پوری سچائی کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ اسی نظم میں آگے دیکھیں:

تُو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی
عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پر و بال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟ [سپاہی، ماوراء، ۷۹]

راشد اس نظم میں سپاہی کے استعارے میں استعمار کے شکنجے میں جکڑے ہندوستانی انسان کو محبت پر آزادی کی کوشش کو فوقیت دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاعر حقیقت پسند ہے جو جانتا ہے کہ اگر وہ خود کوشش نہیں کرے گا تو آسمان اس کی مدد نہیں کرے گا اور نہ ہی قومیں آسمانی امداد سے آزاد ہو سکتی ہیں۔ نظم میں فرد کے داخلی اضطراب کے ساتھ معاشرے کا اجتماعی درد پوری جذباتی اور احساساتی شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نظم میں رومانی استعارے کو کمال ہنر مندی کے ساتھ سماجی علامت میں ڈھالا گیا ہے۔ جو معاشرتی اضطراب، بے چینی، روحانی کرب اور احساس غلامی کے تمثال سے اپنی اثر انگیزی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

اس غلامی اور تذلیل کا اظہار نظم ''دریچے کے قریب'' میں دیکھیں:

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا

کھول مے رنگ جُنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت۔۔۔اُداس
تین سو سال کی ذلت کے نشاں
ایسی ذِلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی! [دریچے کے قریب، ماوراء، ۹۷]

راشد کی نظم میں بیان انسانی المیہ کے پہلو کو عمران ازفرنے خوبی سے بیان کیا ہے:

''راشد تاریخ اور سماجی حقیقت کو نئے سرے سے خلق (Re. create) کرنے اور واقعہ کو افسانہ بنانے کی غیر معمولی طاقت رکھتے ہیں۔ بظاہر عام اور معمولی واقعات کے غیر معمولی نتائج برآمد کرنا، جزئیات نگاری اور چھوٹی چھوٹی اشیاء کے بیان سے ایک ہمہ گیر اور پیچ دار فضا تخلیق کرنا، عام انسانی اور واقعاتی صورت حال سے ایک ازلی اور عالمی انسانی ٹریجڈی کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ اسے ایک عالمگیر حقیقت کے طور پر پیش کرنا، یادداشت کی مدد سے اپنے گزرے ہوئے زمان کو موجود اور آئندہ کے ساتھ ایک ترتیب کے ساتھ پیش کرنا، ہماری نئی نظم کے اس شاعر کے بنیادی شخصی اور تخلیقی خصائص ہیں۔''[۸]

بڑے تخلیق کار کا وصف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی شعری دنیا کسی ایک رنگ کے زیرِ اثر تعمیر نہیں کرتا، وہ محض رومانی قصوں کو نظم کرنے کی مائل نہیں رہتا، نہ ہی وہ اپنی شاعری کو خاص نظریے کی بھینٹ چڑھا کر سپاٹ بناتا ہے، نہ اس کے ہاں اسلوب کے کمالات سے محض ہنرکاری کے تمثال تخلیق کیے جاتے ہیں بلکہ وہ اپنے

زمانے اور زمین کے سیاسی سماجی حالات، قومی اور ملی صورت حال میں فرد کی حیثیت ایسے تمام عوامل کے باہمی امتزاج سے بر مبنی حقیقت فکری وحدت تشکیل کرتا ہے۔ راشد کے نظمیہ متون میں اس نوعیت کے سماجی شعور کا اظہار اپنی پوری تخلیقی قوت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ تاریخ کے وہ کردار جن کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اقبال اسلامی ملت کے احیاء کی کاوشیں کرتے ہیں، ان کا استعاراتی تفاعل راشد کی نظم میں مختلف ہے۔ راشد حال میں زندہ رہنے والا حقیقت پسند شاعر ہے جس کے ہاں نوآبادت کے ستم کے نشانات روح کی گہرائیوں تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ نظم "سباویراں" میں استعمار اور نوآبادیات کے اس تعلق کا بیان دیکھیں:

سلیماں سر بزانو، تُرش رو، غمگیں، پریشاں مو
جہانگیری، جہانبانی، فقط طرارہء آہو
محبت شعلہء پُراں، ہوس بُوئے گُلِ بے بُو
زرازِ دہر کمتر گو!
سباویراں کہ اب تک اس زمین پر ہیں
کسی عیار کے غارت گروں کے نقشِ پا باقی
سا باقی، نہ مہروئے سا باقی!
سلیماں سر بزانو،
اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے؟
کہاں سے، کس سبُو سے کاسہء پیری میں مے آئے۔
[سباویراں، ایران میں اجنبی، ۱۴۹]

راشد کی نظم میں کاسہء پیری کا یہ استعارہ نوآبادیات کے افراد کا اپنی خوشیوں کے سامان کے لیے اپنے استعمار کی طرف دیکھنے کی نشاندہی کر رہا ہے کہ نوآبادیاتی اقوام کو اپنے بنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے بھی ان طاقتوں کے آگے درخواست گذاری کرنا پڑتی ہے۔ یہی وہ کرب اور تکلیف ہے جس کے تمثال راشد

کی نظم میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں اس کے لیے جہانگیری جہانبانی کے دعویٰ جات محض بڑھکیں ہیں جو غلام اقوام اپنی ذہنی تشفی کے لیے مارتے رہتے ہیں ورنہ اس زمین کا سلیمان سر اپنے زانو میں دئے اپنی بے کسی اور لاچارگی کا اعلان کر رہا ہے۔ سلیماں تُرش رو ہے اور اپنی غلامی کے صدمے میں گھرا ہوا غمگیں جس کے چہرے سے پریشاں کے آثار نمایاں ہیں۔ نوابادیات میں بسے سلیمان کے لیے محبت بے معنی چیز ہے کیونکہ اس کی زمین پر غارت گر/استعمار کے نشان باقی ہیں جب تک یہ نشان رہیں گے اس وقت تک ان کے کاسہ میں مے کی بہار آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایران میں اجنبی کی ایک اور نظم "من و سلویٰ" دیکھیں:

ہم اس کے مجرم نہیں ہیں، جانِ عجم نہیں ہیں،
وہ پہلا انگریز
جس نے ہندوستان کے ساحل پہ
لا کے رکھی تھی جنسِ سوداگری
یہ اس کا گناہ ہے
جو ترے وطن کی
زمین گل پوش کو
ہم اپنے سیاہ قدموں سے روندتے ہیں!
[من و سلویٰ، ایران میں اجنبی، ۱۸۸]

راشد انگریز استعمار کے بربریت کو کس خوبی کے ساتھ تخلیق کرتے ہیں اردو نظم کے اور کسی شاعر نے اسلوب اور اظہار کے ان پیراوں تک رسائی حاصل نہیں کی، گو اس سے مراد نظم کی روایت میں دیگر شعرا کو کم تر ثابت کرنا نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ راشد کے ہاں وسط ایشیائی ریاستوں کے سیاسی سماجی منظر نامے کو شاعرانہ خوبی کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ ایک اور نظم "نارسائی" دیکھیں:

رستگاری کا رستہ یہی ہے

کہ ہم ایک ہو جائیں، ہم ایشیائی!
وہ زنجیر جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب اسے پڑنے لگی ہے
کہ ہم ایک ہو جائیں۔۔ ہم ایشیائی!
[نارسائی، ایران میں اجنبی، ۲۰۱]

وہ زنجیر جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم، وسط ایشیائی خطوں میں اسلام کے پھیلاؤ اور اس آفاقی دین کی بنیاد پر باہمی اتحاد کی لازوال روایت سے راشد موجود حالات میں مسلمانوں کی بے کسی اور سیاسی سماجی تنہائی کو بیان کر رہے ہیں، جسے انگریز نے اپنی تاجرانہ حکمت عملی اور سازشی منصوبہ سازی سے پایہ تکمیل کو پہنچایا اور اس خطے کے مسلمانوں کو تنہائی اور معاشی کمتری کے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ ان خطوں میں نوآبادکار نے نہایت چالاکی سے اپنی برتری کو ثابت کیا اور مسلمانوں، ان کی ثقافت سمیت تمام سیاسی سماجی عوامل کو کمتر ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہاب اشرفی نوآبادیاتی مفکرین میں ایڈورڈ سعید کے نظریات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سعید کا خیال تھا کہ تخلیق کار کی بنیادی ذمہ داری اپنے سماجی فرائض کو پوری ایمانداری سے ادا کرنا ہے۔ اس حوالے سے وہ دانشوروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ:

> ''ایڈورڈ سعید نے دانشوروں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنے فرائض کو فراموش کرتے ہیں اس لیے کہ وہ بربریت کے سلسلے میں یا تو چشم پوشی کرتے ہیں یا اسے نظرانداز کرتے ہیں یا اس کو کوئی غلط جہت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔''[۹]

یہ ایک صاف حقیقت ہے کہ راشد نے نا صرف اپنے عہد کے سیاسی سماجی شعور کو پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ اس نے اپنے فرائض کو فراموش نہیں کیا، نہ ہی وہ بربریت کے سلسلوں سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی غلط رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ راشد کا مزید کمال یہ ہے کہ وہ قوم کو ماضی کی عظمت کا گیت سنانے کی بجائے حال کی بدحالی کے تمثال دکھاتا ہے۔ وہ ان سے انگریز سوداگروں کی

چال بازی کو سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہم ایشیائی مسلمان اتحاد و یگانگت کی اسی لڑی کو پھر سے پروئیں، ہم جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک دوسرے سے باہم جڑے ہوئے تھے۔ مگر نہ تو ہماری تنقید نے راشد کی شاعری کے اس پہلو پر خاص توجہ دی اور نہ ہی ہم نے جدیدیت کے علوم کو فروغ دیتے ہوئے، اردو ادب کے ثقافتی مطالعات کی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ قابل فکر پہلو یہ ہے کہ ہم آج بھی علی گڑھ تحریک، الطاف حسین حالی کے مقدمے اور انجمن پنجاب کے بنائے ہوئے قومی التباس کی پیروی میں مصروف عمل ہیں جبکہ در حقیقت وہ سب متون نوابادکار کی سہولت کاری کے لیے خود نوآبادکار کے پھیلائے ہوئے تھے جن کا مقصد نوآبادیاتی حکومت کا استحکام اور مقامی لوگوں پر نوآباکار کے علم و فضل کی دھاک بٹھانے تھی جس کا جوہر مقامی اقوام کی کمتری پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ اج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نوآبادکار کی طرف سے منظم انداز پر پھیلائی گئی ان فکری تحریکوں کو علمی ڈسکورس کا حصہ رکھنا ہے جو ہماری شناخت کے درپئے ہیں اور جن کا اصل ایجنڈا ہمارے اندر غلامی کی جینیات کا فروغ ہے یا ہم نے بطور ایک آزاد قوم کے اپنے فکر و خیال اور اپنی علمی روایت کو وسعت دینی ہے جن کا منبع ایک طرف ہماری دینی تعلیمات سے ماخوذ ہے تو دوسری طرف تہذیب کے اعلی نظام سے جڑے ہزاروں برس کی انسانی عظمت سے پیوست ہے۔ راشد کی نظم موخر الذکر شناخت کو اپناتی ہے جو ایشیائی ممالک کے اتحاد سے اپنی الگ پہچان کا خواہاں ہے اور انگریز استعمار سے آزادی کا نصب العین لے کر آگے بڑھتا ہے جس کی مثالیں اس کے شعری مجموعوں میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔

حوالہ جات

۱. ضمیر علی بدایونی، ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت''، مشمولہ: جدیدیت کا تنقیدی تناظر، مرتبہ: اشتیاق احمد (لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۴۷۔

۲. گوپی چند نارنگ، ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت''، مشمولہ: ادب کا بدلتا منظرنامہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ: گوپی چند نارنگ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۳۹۔

۳. الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبین: شاہد نواز، محمد نعیم (سرگودھا: شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۱۔

۴. محمد نعیم، اردو ناول اور استعماریت (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۴۔

۵. نعیم مظہر، ڈاکٹر، عثمان غنی، ''۱۸۵۷ء سے قبل اردو شاعری میں حب الوطنی کے عناصر''، مشمولہ: تحقیقی زاویے (سہ ماہی)، شمارہ نمبر ۸، الخیر یونیورسٹی، بھمبر، آزاد کشمیر، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰۵۔

۶. سہیل احمد، ڈاکٹر، ''قدیم و جدید غزل اور ہمارے تہذیبی تغیرات''، مشمولہ: بازیافت، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ ۱۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۵۔

۷. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹۔

۸. عمران ازفر، نئی نظم نئی تخلیقی جہت (ملتان: بیکن بکس، اشاعت دوم، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۳۸۔

۹. وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات و ممکنات (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۱۰۔